دیپک کنول کے افسانوں میں
امن و انسان دوستی کا پیغام

ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر طٰہٰ

دیپک کنول وادی کشمیر کے ایک منجھے اور سلجھے ہوئے افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں جو کہ یہاں سے ہجرت کر کے آج کل ممبئی میں قیام پزیر ہیں۔اُن کا اصلی نام دیپک کمار کنول ہے لیکن قلمی نام پہلے ڈی۔کے۔کنول اور بعد میں دیپک کنول اختیار کیا۔''برف کی آگ''،''پمپوش''،''لال پُل کا دیوانہ''اور''میرے گاؤں کا چنار'' کے عناوین سے ابھی تک ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوئیں، جنہیں خاصی پزیرائی حاصل ہو چکی ہے۔ان کے افسانوں کو سرزمین کشمیر سے باہر ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی سراہا گیا۔ان کے افسانوی مجموعے''پمپوش'' کو مہاراشٹرا اُردو اکادمی کی طرف سے ۲۰۱۳ء میں اعزاز سے نوازا گیا اور''لال پُل کا دیوانہ'' کو بہار اُردو اکادمی کی جانب سے ۲۰۱۶ء میں ایوارڑ سے نوازا گیا۔

ان کے افسانوں کا جب باریکی بینی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو آپ بار بار محبت، اخوت، امن اور انسان دوستی کا راگ الاپتے ہوئے نظر آتے ہیں اور قدم قدم پر نفرت، کینہ، بغض، دوئی، تفریق، قتل و غارتگری، دہشت گردی، فساد، گندھی سیاست وغیرہ جیسے انسانیت سوز اور امن دشمن عناصر کو سرنگوں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے خود اپنے افسانوی مجموعے''میرے گاؤں کا چنار'' کے مقدمہ میں

اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''میں حقیقت پسند افسانہ نگار ہوں..... میں وہی لکھتا ہوں جو دیکھتا ہوں یا محسوس کرتا ہوں۔ میں امن و آشتی اور بھائی بندی کا خواہاں ہوں اور یہی پیغام لے کر چلتا ہوں..... محبت بانٹنا اور بھائی چارے کا ترانہ گانا میرے خون میں شامل ہے۔ میں اسے اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا۔''[1]

انہوں نے کشمیر کی سسکتی اور درد انگیز زندگی کو خود اپنی آنکھوں سے نہایت قریب سے دیکھا ہے اور دل سے محسوس کیا ہے اور اسے صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہوئے اخوت، ملنساری اور انسانیت کی قندیلیں دلوں میں روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر بے انتہا زور دیا۔ اس ضمن میں انہیں اپنی ہندو برداری کی اور سے طعن و تشنیع کے تیز اور نوکیلے تیر بھی اپنے سینے پر برداشت کرنے پڑے لیکن انہوں نے ہندو مسلم یکجہتی اور اتحاد کے پیغام کو اپنے سے جدا ہونا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا۔ ان کے یہاں ہندو مسلم آپسی بھائی چارے کی مثال اگر چہ بہت سارے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے تاہم ان کے ایک افسانوی مجموعے ''میرے گاؤں کا چنار'' کا انتساب بھی اس بات پر صداقت کی مہر ثبت کرتا ہے۔ جس کا انتساب انہوں نے غیر جانبدارانہ طور پر عصبیت کی موٹی عینک کو اتار کر ایک مسلمان لڑکی کے نام کیا ہے جس سے وہ محض بہن کہہ کر پکارتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''وہ ممتا کی مورت تھی۔ وہ ایثار کی دیوی تھی۔ وہ میرے لیے اُس روشن مینار کی طرح تھی جو بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ دکھاتا ہے۔ وہ میری بہن تھی۔ میری اختر بی بی جس نے مجھے جھولیاں بھر بھر کے پیار اور دلار دیا۔ جس نے مجھے کسی غیر ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ اوروں کے لیے دلیپ کمار کی چھوٹی بہن اور کے آصف مرحوم کی زوجہ تھی مگر میرے لیے وہ میری بہن تھی۔ میری اختر دیدی۔ میری پیاری اختر دیدی۔ میں یہ مجموعہ اُسی کے نام

منسوب کرتا ہوں۔''[۲]

اس ضمن میں ان کے افسانوں سے بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہین جو ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور آپسی بھائی چارے کی طرف اشاریہ ہیں۔

انہوں نے معاشرتی اور ملکی سطح پر ان تمام شر پسند عناصر و عوامل پر طنز کے تیر چلائے ہیں جو اخلاقی قدروں اور بھائی چارے کی راہ میں سنگ گراں بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں امن و امان قائم کرانے والا ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خلافِ امن قائم کشیدگی کی بار بار مذمت کرتے ہوئے اس کے جلو میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ ان دونوں ملکوں کی آپسی چپکلش کے پیچھے چند خود غرض افراد و عناصر ہیں جو ان دونوں ملکوں کے درمیان امن و آشتی کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ ان دونوں ملکوں کے درمیان پھیلی ہوئی نفرت کی زہریلی ہوا کو محض چند مفاد پرستوں کی دین قرار دیتے ہیں۔ ورنہ انہیں معلوم ہے کہ دونوں اطراف کے لوگوں کے دلوں میں محبت اور بھائی چارے کا جذبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کو پاکستانی رسالوں نے بغیر کسی مذہبی و ملکی منافرت کے چھاپ کے عزت بخشی۔ اس بارے میں خود گویا ہیں:

''پاکستانی رسالوں کا ذکر کرنے کا مقصد اپنی بڑائی جتانا نہیں بلکہ آپ سب کو اس بات سے روشناس کرانا ہے کہ یہ جو نفرت اور عداوت کی زہریلی ہوا چلی ہے یہ دونوں اطراف سے چند مفاد پرستوں کی پیداوار ہے جنہیں دوستی کی فضا راس نہیں آتی۔ جن کی دوکانیں نفرت اور مخاصمت کے سہارے ہی چلتی ہے۔ جب کہ اس پار اور اُس پار کے لوگوں کے امن کے خواہان ہیں۔ اور ایک دوسرے کے قدر دان ہیں۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت میری کہانیاں ہیں جو وہاں کے رسالوں میں بغیر کسی دقت کے چھپتی رہی ہیں۔''[۳]

وہ ان دونوں ملکوں کے لوگوں کی آپسی محبت اور رواداری کو سب وشتم کرنے کا ذمہ دار محض گھٹیا اور گندی سیاست کو گردانتے ہیں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجود اس نفرت کی دیوار کو اپنے تیشہ اور شرار قلم سے بار بار مسمار کرنے کی کوشش انجام دیتے ہیں۔ افسانہ ''لال پُل کا دیوانہ'' جو کہ اس پار کے لڑکے اور اُس پار کی لڑکی کے پیار و محبت کی کہانی ہے، اس میں انہوں نے جمیل خان نامی ایک گوجری نوجون کے ایک کردار کے ذریعے سیاست کے بدنما کھیل کو بے نقاب کرتے ہوئے یوں محبت اور اخوت کا جذبہ اُبھارنے کی سعی کی ہے:

''وہ تو بہت سیدھا سادا انسان تھا۔ وہ تو محبت کرنا جانتا تھا۔ وہ سیاست کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں جانتا تھا کہ دونوں ملکوں نے محبت کے جذبے پر اتنی ساری پرتیں چڑھا رکھی ہیں کہ ان پرتوں کو کھولنے کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ وہ ان رقابتوں سے بے خبر تھا۔ اُس کے لیے تو اُس کی دنیا ایک کوہستان سے شروع ہوتی تھی تو دوسرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔''[۴]

اس پار کے لڑکے جمیل خان اور اُس پار کی کی لڑکی گل افروز کی پیار و محبت میں اگر چہ دونوں ملکوں کے درمیان کی لکیر پریشانی کھڑا کرتی ہے مگر اُن کا جذبۂ محبت اس لکیر کو اپنی محبت میں آڑے نہیں آنے دیتی ہے۔ اس افسانے کا اختتام بھی گندھی سیاست یا سیاسی کھیل پر ایک زوردار طمانچہ ہے:

''اس سے پہلے کہ پلیس والے گاڑھی کو نکال پاتے وہ پیچھے سے فرار ہو گیا۔ وہ وہاں سے سیدھے ندی کی طرف بھاگا اور اُس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ندی میں چھلانگ ماری۔ یہ دیکھ کر اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اُس نے گل افروز کو کنارے پر اُس کا انتظار کرتے پایا۔ وہ طوفانی لہروں سے لڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا مگر اس بار ندی ایسی بپھری ہوئی تھی کہ وہ جمیل خان کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے لگی۔ وہ گل افروز تک نہیں پہنچ پایا۔ گل افروز نے

جب اُسے بہتے دیکھا تو وہ بھی ندی میں کود گئی۔ دو دن بعد پولیس کو ان دونوں کی لاشیں مل گئیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہو کے رہ گئے تھے۔ جیسے وہ ایک دوسرے میں سما گئے تھے۔ اُن کی لاشیں دیکھنے کے لیے ساری مخلوق پولیس تھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ لال پُل کے اس دیوانے کا ایک بار دیدار کرنا چاہتے تھے جس نے سیاست کو ایک بار پھر شرمسار کر دیا۔''[۵]

دونوں ملکوں کے مابین دوستانہ تعلقات اور بھائی بندے کو فروغ دینے کے خاطر جہاں انہوں نے مفاد پرست عوامل اور گندھی سیاست پر تنقید کے تیز تیر چلائے وہیں اپنے افسانوں کے مقام اور کردار بھی زیادہ تر دونوں ملکوں سے انتخاب کیا ہے۔ سنتا کی گوری، مرغی چور، پمپوش، مچھلی والا، لال پُل کا دیوانہ وغیرہ جیسے افسانوں میں انہوں نے پیار و محبت اور بھائی چارے کی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔

وہ پچھلی دہائیوں سے کشمیر کے دلدوز اور دلخراش حالات و واقعات پر مسلسل خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ ان کے بہت سارے افسانے سن نوے کے اُن حالات کا نوحہ کرتے ہیں جب کشمیر ہر طرف ظلم و بربریت، نفرت و عداوت اور کشت و خون کا بازار گرم ہونے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ افسانہ ''ایک تھا بلبل'' ہو یا افسانہ ''پوشہ مال''، دونوں دہشت کی آندھی کا جگر خراش منظر بیان کرتے ہیں۔ اس آندھی کے تئیں انسانی رشتوں کا بکھراؤ، ہجرت کا درد و کرب، انسانی جان و مال کا بے دریغ زیاں اور خوف و ہراس کا ماحول سب ہی کچھ ان کے افسانوں میں سمٹ آیا ہے۔ افسانہ ''پوشہ مال'' کا یہ آخری اقتباس اس خوف و دہشت اور ظلم و بربریت پر غیر محسوس طریقے سے توہین و تذلیل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

''رات جب ایک بندوق بردار پوشہ مال کے گھر میں ملک الموت بن کے پہنچا تو ننھا گلزار نانی کے بغل میں لیٹا ہوا تھا۔ باہر بڑی خوفناک رات تھی اور

اندر معصوم گلزار کے دل میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اسے وہ منظر یاد آ رہا تھا۔ جب اس کے ماں باپ خون میں لت پت اس کی آنکھوں کے سامنے پڑے تھے اور وہ مرد بھی نہیں پایا تھا۔ وہ اسی طوفان سے لڑتا جا رہا تھا کہ اچانک اُسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب اس کی نظر بندوق بردار پر پڑی تو ایک پل کے لیے اس کا خون سوکھ کے رہ گیا۔ اگلے ہی پل میں اس نے نانی کو جگانے کی کوشش کی۔ گھر میں کھل بلی مچ گئی۔ گلزار نے دیکھا کہ بندوق بردار نے آگے بڑھ کر نانی کی طرف نشانہ باندھ لیا۔ گلزار کو لگا کہ وہ ایک بار پھر یتیم ہونے جا رہا ہے۔ اسے پہلے کہ گولی چل جائے وہ ڈھال بن کے نانی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد گولیوں کی آواز نے رات کے سناٹے کو چیر ڈالا۔ آواز سن کر سارا گاؤں جاگ گیا اور پھر لوگ لشتم پشتم گھروں سے نکل کر پوشہ مال کے گھر کی طرف دوڑنے لگے۔ وہاں کا نظارہ دیکھ کر ہر کوئی سم ہو کے رہ گیا۔ پوشہ مال اپنے سر پر خاک ڈالے گلزار کے بے جان جسم کو اپنے گود میں لے کر ایسے بیٹھی تھی جیسے آج اس کی حقیقی اولاد کی موت ہوئی ہو۔''[۵]

کشمیر سے بچھڑنے کے سانحہ نے ان کی زندگی کو جھنجوڑ کر کے رکھ دیا۔ اپنے آبائی وطن سے بچھڑنے کے بعد وہ جسمانی اور روحانی طور پر کرب و عذاب اور داخلی گھٹن کا شکار رہا۔ یہ سچ ہے کہ ان کی زندگی میں پھر رفتہ رفتہ خوشحالی اور سدھار آتا گیا لیکن اس سانحہ عظیم کو زندگی کی کسی بھی سطح پر بھول نہیں پایا۔ یہ اندرونی درد و کرب لاوا بن کر بعد میں ان کی تحریروں میں صورت میں باہر پھوٹا۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ان حالات و واقعات کو نہیں بھولا جنہوں نے کشمیر کے امن و امان اور بھائی چارے کو تہہ و بالا کر کے ہر سو خوف و ہراس اور نفرت کی زہر پھیلا دی۔ وہ ان صعوبتوں اور ستم

ظریفیوں سے اپنے ذہن ودل کو کنارہ کش نہ کر پا سکے جو اسے گھر سے بے گھر ہونے پر اُٹھانی پڑی۔ افسانہ ''سناٹا'' میں انہوں نے اس درد پنہاں کو یوں زبان دی ہے:

''کہاں گئے وہ دن جب ہم اس گاؤں میں بڑے چین وامن سے رہ رہے تھے میرے اڑوس پڑوس میں جتنے بھی گھر تھے میری ہی برادری کے تھے۔ میں نے روزن سے جھانک کر دیکھا تو باہر مجھے چند مکان نظر آئے جو اپنے مکینوں کے انتظار میں آنکھیں بچھائے نہ جانے کب سے حسرت و یاس کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ یہ مکان بھی بڑے ویران اور شکستہ دکھائی دے رہے تھے میں سوچتا رہا کہ آخر وہ سب لوگ تنکوں کی طرح بکھر کیوں گئے جو کبھی ایک سموہ میں رہتے تھے.....

جس دن میں نے گھر چھوڑا تھا اسی دن میں نے اپنی آتما یہیں چھوڑ دی تھی۔ وہ جو تمہارے ساتھ چلا تھا وہ محض میرا جسم تھا۔ جسم کو تو فنا ہونا ہی تھا سو فنا ہو گیا۔ پر روح۔ وہ تو اس گھر کے آس پاس ہی بھٹکتی رہے گی۔ ایک بات یاد رکھنا بیٹا یہ جو گھر ہوتا ہے نا یہ انسان کے لیے سب سے بڑی عبادت گاہ ہوتی ہے..... جب یہی گھر اسے چھن جاتا ہے تو پھر اس کا جینا کیا مرنا کیا۔''[۶]

اُن کی نظریں بغور مشاہدہ کرتی ہیں کہ انسانیت کا تار و پود بکھر چکا ہے۔ ان کا قلم قوموں، قبیلوں اور ملکوں میں پنپنے والی منافرت کی داستان لکھ کر خون کے آنسوں روتا ہے۔ لیکن دیپک کنول کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خود ان ناگفتہ بہ حالات سے جوجنے کے باوجود اپنے افسانوں میں یاس اور قنوطیت کی فضا قائم کرنے نہیں دیتے ہیں بلکہ وہ ہر سطح پر ایک روشن مستقبل کا عندیہ دیتے ہوئے رجائیت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کے ایک افسانے ''میرے گاؤں کا چنار'' پڑھ کر ہی ہوتا ہے جہاں ایک چنار کو مخاطب ٹھہرا کر رہزنوں اور لٹیروں کے ہاتھوں ظلم و تشدد اور اپنے سے سب کچھ جدا ہونے کی داستان سناتا ہے۔ پورے

افسانے پر اگرچہ یاس اور افسردگی کے ساتھ ساتھ ظلم و بربریت کے بادل منڈلاتے ہوئے دیدنی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود افسانے کے اختتام پر یہ رجائیت بھر پیغام بھی دیکھنے کو ملتا ہے:

''زندگی یوں ختم نہیں ہوتی ہے کہیں نہ کہیں اپنی رمق چھوڑ کے جاتی ہے اور پھر زندگی کی یہی رمق ایک نئی زندگی کو جنم دیتی ہے۔کل جب نئی ہوا چلے گی تو تمہاری جڑوں سے ایک نئی کونپل پھوٹے گی جو محبت کا، دوستی اور بھائی چارے کا، امن و آشتی کا پیغام لے کر آئے گی۔تب میں اسی مٹی سے نیا جنم لوں گا اور پھر تمہاری ڈالیوں میں رسّی ڈال کر جھولا جھلا کروں گا اور محبت اور اُلفت کے گیت گاوں گا۔میں قنوطیت پسند نہیں، رجائیت پسند ہوں۔''[۷]

ان کے افسانوی مجموعے ''پمپوش'' کے آخری افسانہ ''پمپوش'' میں انسانیت اور ہمدردی کے پیغام کا دریا موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے:

''آج وہ اس سے ملنے جا رہی تھی جس میں اسے اپنے دادا کی شبیہہ نظر آتی تھی وہ سوچنے لگی کہ وہ کس طرح مادھو کا سامنا کر پائے گی کیا وہ اسے اس بات کے لیے ڈانٹے گا نہیں کہ اس آریت وقت میں اس نے ایک بار بھی اس کی سدھ نہ لی وہ انہی سوالوں میں الجھی ہوئی جب گنپت یار کے مندر کے اندر پہنچ گئی تو یہ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھل پڑا مندر میں شو کی مورت کی جگہ خود مادھو جو براجماں تھا۔وہ اپنی خوشی کے آنسوں روک نہ سکی اور بے قابو ہو کر اس نے اپنی تھیلی میں رکھے سارے پمپوش نکال کر اس کی طرف اچھال دئے۔پھر وہ ریلنگ کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔رونے کی آواز سن کر باہر پہرا دے رہے سی آر پی کے کچھ جوان بندوقیں تان کر اندر آ گئے۔ایک عورت کو مندر کے اندر دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گئے انہوں نے ہڑبڑاہٹ میں اسے پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے وہ

مسلسل روتی چلاتی رہی۔شورسن کر مندر کا نیا پجاری اپنے کمرے سے باہر آ گیا اس نے جب ایک مسلم خاتون کی درشاد دیکھی تو اس نے اسے نوجوانوں سے چھڑالیا اور اسے ایک کونے میں بٹھا کر پوچھا ''تم اس مندر میں کیسے آ گئی ہو بہن؟ وہ وہ جو مادھو اندر بیٹھا ہے میں اسے ملنے آئی ہوں۔ مادھو جو اندر بیٹھا ہے اس نے چونک کر پہلے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے سراپا کا طائرانہ جائزہ لے کر وہ بڑی رقت بھری آواز میں بولا ''تمہیں بھرم ہوا ہے بہن۔ مادھو یہاں کہاں ہوسکتا ہے اسے تو مرے ہوئے ایک سال ہوگیا۔ پچھلے سال جموں میں سانپ کے کاٹنے سے اس کی موت ہوگئی۔ ''نہیں'' وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی اور پھر سختی سے بولی۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مادھو جو کبھی مر نہیں سکتا وہ اندر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''[۸]

من جملہ طور پر اگر دیکھا جائے تو ان کے افسانوں کے بین السطور میں ہمیں کہیں نہ کہیں ضرور علامہ اقبالؒ کے ان اشعار کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

ہوس نے کر دیے ہیں ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زبان ہو جا
فرقہ بندی ہیں کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

محبت اور امن و اخوت کا ارگ اپنے افسانوں مین الاپتے ہوئے انہوں نے نہایت ہی دلکش ، شرین اور شفاف زبان کا استعمال کیا ہے۔ مشکل استعاروں اور علامتوں سے بہت حد تک گریز کیا ہے تا کہ امن ومحبت اور بھائی چارے کا پیغام عام قاری بھی نہایت آسانی اور اچھے طریقے سے پا سکے۔ ایک طرف قاری ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کشمیر کے دلکس مناظر اور زباں و بیاں سے

جمالیاتی حظ پاتا ہے تو دوسری طرف ان کے افسانوں میں درد و محبت کی زریں لہروں میں بہتا چلا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱) دیپک کنول، میرے گاؤں کا چنار (افسانوی مجموعہ)، جواہر پبلیکیشنز، ممبئی، ۲۰۱۷، ص ۸

۲) دیپک کنول، میرے گاؤں کا چنار (افسانوی مجموعہ)، جواہر پبلیکیشنز، ممبئی، ۲۰۱۷، انتساب، ص ۳

۳) دیپک کنول، میرے گاؤں کا چنار (افسانوی مجموعہ)، جواہر پبلیکیشنز، ممبئی، ۲۰۱۷، ص ۷

۴) دیپک کنول، لال پُل کا دیوانہ، افسانہ لال پُل کا دیوانہ

۵) ایضاً

۶) دیپک کنول، لال پُل کا دیوانہ (افسانوی مجموعہ)، افسانہ ''پوشہ مال''

۷) دیپک کنول، میرے گاؤں کا چنار (افسانوی مجموعہ)، جواہر پبلیکیشنز، ممبئی، ۲۰۱۷، ص ۱۰۲۔۱۰۳

۸) دیپک کنول، میرے گاؤں کا چنار (افسانوی مجموعہ)، جواہر پبلیکیشنز، ممبئی، ۲۰۱۷، ص ۱۵۸

۹) دیپک کنول، پمپوش (افسانوی مجموعہ)، فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۰